کلیاتِ فیض ــــ 'نسخہ ہائے وفا' ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد ساجد خان*

Abstract:
This paper is critical and Research Evaluation of Faiz Ahmad Faiz's complete poetic works known as "Nuskha Haiya Wafa". By evaluating this Quliyat of Faiz, the author of this article has provided a detailed suty of Faiz's Poetry. This Quliyat consist of seven collection of Faiz. While giving a comprehensive view or the back-ground of Faiz's Poetry and ideology, author has also pointed out the main aspects and trends of his poetic genius. By doing so writer has given examples of relevant verses and poems from the whole Quliyat. In this way, it is brief selection of Faiz's most representative verses.

'نسخہ ہائے وفا' فیض کی تمام شعری تصانیف کا مجموعہ ہے ان تصانیف میں 'نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ، سرِ وادیٔ سینا، شامِ شہرِ یاراں اور مرے دل مرے مسافر' شامل ہیں۔ آخری دور کا کلام ''غبارِ ایام'' کے عنوان سے کتاب کے آخری ۳۶ صفحات پر درج ہے۔ اس کتاب میں فیض کی تمام شعری تخلیقات شامل ہیں یہ پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی اور اب تک اس کے پچاسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں تاہم اب اس کے ناشر (مکتبہ کارواں کچہری روڈ، لاہور) تاجرانہ عاقبت اندیشی کے سبب ہر اشاعت پر نہ تو اشاعتِ اوّل کا سن درج کرتے ہیں اور نہ ہی اُس اشاعت کا نمبر شمار یا تاریخ مذکور کرتے ہیں(۱) اشاعتِ دوم سے اب تک تمام اشاعتوں کو مصور ایڈیشن کا نام دیا گیا ہے اس میں اسلم کمال کی کل آٹھ تصاویر (ہر مجموعہ کلام کے آغاز میں ایک) جو فیض کے کسی شعر یا نظم کے پس منظر میں بنائی گئی ہیں، شامل ہیں۔ کتاب پر کچھ لکھنے سے پیشتر فیض کے بارے میں چند بنیادی نوعیت کی معلومات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔

فیض ۱۳ جولائی ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد خان بہادر سلطان محمد خان بیرسٹر نے بکریاں چرانے سے زندگی کی ابتدا کی اور دولتِ افغانستان کی طرف سے لندن میں سفیر کے عہدے تک پہنچے۔ فیض نے انٹر مرے کالج سیالکوٹ سے، بی اے اور انگریزی ادب میں ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے اور ایم اے عربی ادب،

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

اورینٹل کالج لاہور سے کیا۔۱۹۳۵ء میں ایم اے او کالج امرتسر سے لیکچررشپ کا آغاز کیا۔۴۰ سے ۴۲ تک ہیلی کالج لاہور میں بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بانی رکن اور پنجاب شاخ کے سیکریٹری بنے، اس عرصے میں ادب لطیف کی ادارت بھی کی۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جون ۴۲ء سے دسمبر ۴۶ء تک فوج کی ملازمت کی اور ابلاغ و اطلاعات کے حوالے سے ریڈیو پر کام کیا۔فوج میں نوکری فیض نے جرمن فاشزم کے خلاف جدوجہد کے اظہار کے لیے کی تھی لہٰذا جنگ ختم ہونے پر فیض نے تن کی سہولت اور کرنیلی کی رعونت دونوں کوالوداع کہہ دیا۔ پاکستان ٹائمز اور امروز کی ادارت کی۔ مارچ ۵۱ء سے اپریل ۵۵ء تک پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں جیل میں رہے۔ دوسری مرتبہ ۵ ماہ کے لیے ایوب کے مارشل لاء میں گرفتار ہوئے۔۳ سال کے لیے پاکستان آرٹس کونسل لاہور کے سیکریٹری رہے۔۷۲ء سے ۷۷ء تک امور ثقافت میں وزارتِ تعلیم کے تحت مشیر رہے۔اس عرصے میں پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس اور لوک ورثہ ایسے ادارے قائم کیے، ۵۸ء سے ایفرو ایشیائی ادبی انجمن کے بنیادی رکن تھے، ۷۷ء سے ۸۲ء تک اسی تنظیم کے سہ ماہی مجلّے لوٹس کی ادارت کی اور زیادہ تر بیروت میں مقیم رہے۔ نومبر ۸۳ء میں پاکستان واپس آ گئے، اکتوبر/نومبر ۱۹۸۴ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔(۲)

نسخہ ہائے وفا چونکہ فیض کا مکمل مجموعۂ کلام ہے اس لیے فیض کی شاعری پر کسی بھی حوالے سے بات کی جائے وہ نسخہ ہائے وفا پر تنقید وتبصرہ ہی قرار پائے گی اس لیے ہم اس مضمون میں فیض کے مجموعہ ہائے کلام پر الگ الگ بات کرنے کی بجائے اُن کے رویوں، موضوعات، رجحانات اور فکروفن پر مجموعی نظر ڈالیں گے۔

فیض کا اولین مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ چونکہ یہ مجموعہ ایک طرف تو اپنے عہد کے مقبول ترین ادبی رویے--- رومانوی طرزِ احساس کا کامیاب اظہار تھا اور دوسرے اس میں عصری آشوب کی اضطراب انگیز پرچھائیاں بھی عکس فگن تھیں۔اس لیے فیض کو اولین مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوگئی۔نقشِ فریادی فنی اور فکری اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ابتدائی حصے میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کا کلام شامل ہے اس دَور کی تمام منظومات میں ابتدائے عشق کا تحیر بنیادی شعری تجربے کے طور پر کارفرما ہے ''یعنی وہی ایک حادثہ جو اس عمر میں اکثر نوجوانوں کو ہوجاتا ہے'' تاہم اس تجربے کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں بامراد شادکامی اور وصل کی سرشار کیفیات کم اور سوزِ مرگ محبت کا بیان زیادہ ملتا ہے۔انتہائی ابتدائی دَور کی اس شاعری میں بھی فیض نے لہجے کی تہذیب اور شائستگی کو برقرار رکھا ہے۔ اُن کی اس دور کی شاعری میں ان کے ہم عصر شعراء مثلاً راشدؔ، کے برعکس وصل کی تمنا کا رنگ، لمحاتی نشاط سے زیادہ احساسِ رفاقت کی خواہش لیے ہوئے ہے۔ ان

نظموں میں جذبوں کی تپش سے نوجوان شاعر کے ہونٹ پپڑائے ہوئے ضرور ہیں لیکن بیان میں ضبط اور ٹھہراؤ نے ایک گہری افسردگی کو جنم دیا ہے۔ فیض کی اس دور کی شاعری کے موضوعات وہی ہیں جو کسی بھی زبان میں ابتدائے شباب کی عشقیہ شاعری کے ہوتے ہیں، غمِ دوست اور یادِ یار کے حوالے سے صحرا میں بہار کا تذکرہ، حسنِ محبوب کے لیے دکھوں، سوگواریت اور تلخیِ ایام سے بچے رہنے کی دعائیں، کبھی تغافلِ دوست کی شکایت تو کبھی اپنی تڑپتی مچلتی آرزوؤں کی التجائیں، عمر کی گریز پائی یاد دلا کر زندگی زرنگار کرنے اور تھوڑا سا پیار کرنے کا مشورہ، کبھی واماندۂ الفت کے قبر میں جا سونے کا ہولناک تصور یاد دلا کر اُسے رام کرنے کی کاوش، کبھی رسیلے ہونٹوں اور حسین آنکھوں سے ظلمتِ روز و شب میں کمی کرنے کی درخواست---غرض وہی مضامین جو ابتدائے عشق کا لازمہ ہوتے ہیں۔ نظموں کے عنوانات پر ہی ایک نظر ڈالنے سے بہت سی باتوں کی وضاحت ہو جائے گی___ خدا وہ وقت نہ لائے، انتہائے کار، انجام، سرودِ شبانہ، آخری خط، حسینۂ خیال سے، مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو، بعد از وقت، انتظار، تہِ نجوم، حسن اور موت، میرے ندیم، آج کی رات۔ اس عہد کی شاعری کا خلاصہ ان کی اس حصے کی نظم 'یاس' کے ان اشعار میں بیان کیا جا سکتا ہے، یہ خلاصہ بھی ہے اور اس دورِ شاعری کے خاتمے کا اعلان نامہ بھی (۳)

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
انتظارِ فضول رہنے دو رازِ الفت نبھانے والو
بارِ غم سے کراہنے والو کاوشِ بے حصول رہنے دو

اس دور کی شاعری میں جذبوں کی شدتوں کا بیان تو ملتا ہے لیکن خود ان جذبوں کو درجہ اعتبار اس لیے حاصل نہیں کہ یہاں معاملاتِ دل کے سلسلے میں کسی فکری کاوش اور فلسفیانہ گہرائی کا سراغ نہیں ملتا۔ غمِ جہاں کا تذکرہ تو ہے لیکن اسے نہ صرف غمِ عشق سے الگ سمجھ کر بیان کیا گیا بلکہ حالات کی تپتی دوپہر سے گھبرا کر ہی سایۂ زلف کی آرزو میں شدت آئی ہے۔ فیض کی اس زمانے کی شاعری پر اُن کے انگریزی ادب کے مطالعے بالخصوص براوننگ اور بائرن کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ابھی نوجوان فیض مرگِ محبت کا غم ٹھیک طرح منا بھی نہ پائے تھے کہ دنیا پر دوسری عالمگیر جنگ کے سائے منڈلانا شروع ہو گئے۔ برصغیر کے سوچنے والے اذہان میں دیس کی غلامی نے جس بے بسی کی صورتِ حال کو جنم دیا ہوا تھا اُس پر عالمی کساد بازاری اور یوں بے روزگاری کا مزید اضافہ ہو گیا۔

برصغیر کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب بقول فیض بچوں کی ہنسی بجھ گئی، کسان کھیت چھوڑ کر شہروں میں روزگار کی تلاش پر مجبور ہوئے۔ اچھے بھلے شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں اور بڑے بڑے تیس مار خان ادنیٰ نوکریوں کی تلاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔(۴) اِس دور میں عالمگیر سطح پر نوآبادیاتی نظام اور استحصال کے خلاف سوشلزم ہی واحد موثر قوت بن کر ابھرا تھا۔ پوری دنیا کے تعلیم یافتہ نوجوان اپنے شعور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے سامراج دشمن تحریکوں اور تنظیموں میں حصہ لے رہے تھے۔ اس زمانے میں برصغیر میں بھی مزدور تحریکوں اور پھر ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے جنم لیا۔ فیض اس زمانے میں امرتسر میں لیکچرر تھے۔ صاحب زادہ محمود الظفر اُن کی بیگم رشید جہاں اور سجاد ظہیر نے فیض کی فکر اور احساس کو ایک موڑ، ایک تبدیلی سے آشنا کیا۔ فیض نے بجا طور پر سوچنا شروع کیا کہ ایک فرد کی ذات اپنی تمام تر خوشیوں، غموں، محرومیوں اور کدورتوں سمیت ایک بے حد معمولی اور حقیر شے ہے اور فرد کی ذات کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ موجودات سے اُس کے ذہنی رشتے پر ہے یہاں پہنچ کر فیض نے دیکھا کہ محبت کا دکھ اپنی جگہ محترم، لیکن یہ واحد انسانی المیہ نہیں ہے، لہٰذا فیض نے نظامی کے بقول دل فروخت کر کے جاں خرید لی اور یہیں سے نقش فریادی کے حصہ دوم کا آغاز ہوتا ہے اس حصے کی پہلی نظم ہے ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''، فیض کے نکتہ چیں اس خوب صورت نظم پر استہزا کرتے ہیں حالاں کہ فیض نے اس نظم میں کہیں بھی حسن یا جذبۂ عشق کی اہمیت کو کم نہیں کیا۔ یہ تو دو حقیقتوں کا اعتراف ہے ایک تو یہ کہ فیض نے اپنے ماضی کے شعری رویے کو رد کیا جو غم ہائے محبت ہی کو کائنات کی واحد سچائی سمجھے ہوئے تھا۔ دوسرے یہ کہ فیض نے زندگی کے تلخ تر اور کڑے مگر موجود حقائق، جیسے صدیوں کے ظلم و جبر کی ان گنت صورتیں، انسانی جسموں کی خرید و فروخت، محنت کا استحصال اور ایسے ہی انسانیت کے رِستے ہوئے ناسوروں کے وجود کو نہ صرف جانا اور تسلیم کیا بلکہ اسے شاعر کا فرض سمجھا کہ وہ زندگی کی ان صورتوں کو بھی فن کا موضوع بنائے، شاعر کا یہ فطری رجحان شاید نہیں تھا لیکن حقیقت خواہش سے بڑا سچ ہوتی ہے۔ لہٰذا

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے ....(۵)

آشوبِ آگہی کے کرب سے ہم آہنگی کبھی سہل نہیں ہوتی لہٰذا فیض کے یہاں نقش فریادی کے دوسرے حصے کا بنیادی تجربہ یہی کرب بن جاتا ہے۔ اب فیض اپنے قاری اور اپنے محبوب کو دکھ درد کی سچائیوں کے جذباتِ محبت پر

ناگزیر اثرات سے آگاہ کرتے ہیں۔ اپنے تاریخی اور اجتماعی شعور کے تحت فیض محسوس کرتے ہیں کہ ایک فرد کی محبت میں کامیابی سے دنیا میں پاپ اور ظلم کا خاتمہ نہیں ہوجاتا محبت کی خوشبو سے ساری دنیا صرف اُسی صورت میں مہک سکتی ہے جب ہر قسم کے استحصال، ظلم و جبر اور ناانصافی کا خاتمہ ہو، دکھ کی جاگیر تو گویا سب کی مشترک ملکیت ہے، یہ تو اجداد کی میراث ہے، لہٰذا فیض کا مشورہ ہے

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں   بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں   سپنوں کی تعبیریں سوچیں .....(۶)

''رقیب سے'' کا موضوع بھی یہی ہے کہ عاشقی کے تجربے کے حوالے سے ہی زیردستوں کے مصائب سمجھے ہیں۔ یاس و حرمان، دکھ درد، سرد آہیں، رخِ زرد سب محبت کے حوالے ہی سے سمجھ میں آتے ہیں لہٰذا اب بےکسوں کی آنکھوں میں سوکھے ہوئے آنسو، ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہوئے عقاب، بازار میں بکتا ہوا مزدور کا گوشت، شاہراؤں پہ غریبوں کا بہتا ہوا لہو، سب نے مل کر شاعر کے دل میں آگ لگا رکھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فیض ظلم کی معیاد اور فریاد کے ایام کے خاتمے کی نوید بھی سناتے ہیں۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم ....(۷)

نظم ''بول'' میں فیض نے زیادہ بلند آہنگ لہجے میں سامراج کے خلاف جدوجہد کی ترغیب دی اور بےیقینی کے گمان میں گرفتار مظلوموں کو اُن کے اختیار سے آگاہ کیا ہے۔ نظم ''موضوعِ سخن'' فیض کے اُسلوب اور شعری رعنائی کی خوب صورت مثال ہے اس کا موضوع بھی وہی شاعر کے افکار کی، اشعار کی دنیا کے دائرہ کار کا تعین ہے۔ یہاں طبعِ شاعر کے وطن ___ جسم کے دل آویز خطوط اور اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں کو برتری حاصل ہے اور فیض کی فن کارانہ دیانت داری یہ کہ انہوں نے شاعر کی حیثیت سے کبھی احساس کی صداقت پر نظریے کی مصلحت کو غالب نہیں آنے دیا۔ اس لیے مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، نہ تو تذلیلِ حسن اور ترکِ عشق تھی اور نہ موضوعِ سخن فیض کا اپنے تبدیل شدہ مسلکِ شعر سے فرار ہے۔

اس مجموعے کی خوب صورت ترین نظم جسے مخالف ناقدین نے بھی سراہنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ''تنہائی'' ہے۔ نو مصرعوں کی اس مختصر نظم میں آس سے یاس تک کے سفر کی داستان کو نہایت برجستہ اور تصویری خوب صورتی سے نظم کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ نظم محض ایک فرد کا انتظار نہیں رہتی بلکہ ایک عہد ایک صبح اور ایک آزاد سحر کا

انتظار بن جاتی ہے اور تنہائی ایک فرد کی بجائے دور غلامی کا نوحہ بن جاتی ہے۔ نظم کا انجام مایوسی کی انتہائی صورت میں ہوا۔

گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا ....(۷)

نقش فریادی کی غزلیں فنی اعتبار سے کسی انفرادیت کی حامل نہیں ہیں ان میں فیض کا وہ لہجہ بالکل سنائی نہیں دیتا جو اُن کے تغزل کی خصوصیت ہے اور نہ ہی فکری طور پر ان میں نظموں سے مختلف یا بہتر کسی خیال کا اظہار ہوا ہے اس لیے ان غزلوں کی اہمیت محض تاریخی ہے ادبی نہیں۔

نقش فریادی فیض کے فنی ارتقا کو سمجھنے کا اہم ترین حوالہ ہے اور شاعری کے اعتبار سے بھی اس کا مقام اُس عہد کے کسی شاعر ___ راشد، مجاز، جذبی، مخدوم وغیرہ کے کسی مجموعے سے کم نہیں ہے۔ تاہم یہ مجموعہ فیض کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس میں فیض کی شاعری کے تمام رنگ اور خصوصیات ملتی ہیں جو اُن کی بعد کی شاعری، بالخصوص زنداں کی شاعری کے دَور میں درجۂ کمال پر دکھائی دیتی ہیں۔

ناقدین کا ایک وسیع حلقہ فیض کو رومانی شاعر قرار دینے پر مُصر ہے تو دوسری طرف ایک بڑی تعداد کے نزدیک وہ انقلابی شاعر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فیض کی شاعری اپنے آغاز میں نجی قسم کی محبت کو بغیر کسی فکری بلند آہنگی کے پیش آتی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ فیض کے فنی وفکری ارتقا کے ہر مرحلے میں ان کے یہاں لب ورخسار کا، زلف و عارض کا احساس و بیان ملتا ہے لیکن ظاہر ہے نہ وارداتِ عشق بیان کرنے والا ہر شاعر رومانوی ہوتا ہے اور نہ جمالِ محبوب کی ستائش رومانویت کی اولین و آخری شرط ہے جب کہ رومانویت تو محض ایک طرزِ احساس کا نام بھی نہیں کیونکہ طرزِ احساس کی حد تک تو ہر شاعرانہ تجربہ رومانویت کے ذیل میں آ سکتا ہے۔ لہٰذا رومانویت محض احساس نہیں بلکہ ایک دبستانِ فکر ہے اور فیض جس شعورِ زیست اور طرزِ حیات کے قائل ہیں اُس کا رومانوی طرزِ فکر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رومانوی طرزِ فکر اور انقلابی طرز احساس میں ابتدائی سطح پر ایک بات مشترک ہوتی ہے اور وہ ہے موجود اور جاری نظام، روایات، اقدار، اشیا، رشتوں غرض ہر شے سے نفرت اور بغاوت، رومانوی فن کار کے یہاں ہر خرابی پر شدید احتجاج تو ملتا ہے لیکن اُس کے پاس تعمیر کا کوئی مثبت حوالہ نہیں ہوتا۔ وہ گردشِ فلک کو، روز وشب کو، تقدیر کو غرض ہر قسم کے بندھن کو برباد اور تباہ کر دینے کی شدید آرزو رکھتا ہے لیکن حقائق کے باطنی رشتوں اور انسانی

تاریخ میں اُس کی نگاہ اتنی گہری نہیں اُترتی کہ وہ مستقبل کی بہتر صورت گری بھی کر سکے۔ لہٰذا ہر انقلابی ایک حد تک رومانوی بھی ہوتا ہے کہ وہ بھی تبدیلی کا آرزومند ہوتا ہے۔ اس حوالے سے فیض رومانوی بھی ہیں لیکن اُن کے یہاں ایک بہتر دنیا، زیادہ حسین زندگی اور ایک ایسے معاشرے کے واضح نقوش بھی ہیں جس میں انسان کو امن، انصاف اور آزادی کے ساتھ خوش حالی اور فروغِ ذات کے تمام تر امکانات دستیاب ہوں۔ شاعر کے منصب کے بارے میں فیض نے کہا ہے کہ ''شاعر کا کام محض مشاہدہ نہیں مجاہدہ بھی اُسی پر فرض ہے گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دھارے کا مشاہدہ اُس کی بینائی پر ہے۔ اُسے دوسروں کو دکھانا اُس کی فنی دسترس پر، اُس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اُس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔'' (۹)

فیض کے نزدیک انسانی تاریخ کے نقوش و آثار کو زندگی کے سمندر میں موجزن دیکھنا فن کار کا اولین فریضہ ہے، لیکن یہی کافی نہیں اگر اُس کی نگاہ گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی جائے لیکن اُن کی منظر کشی میں نطق و لب یاوری نہ کریں اور کریں بھی تو اس طرح کہ اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے اپنے اور دوسروں کے جسم و جاں جہد و طلب پر راضی نہ ہوں تو بھی فنکار فن سے سرخرو ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ فیض مزید لکھتے ہیں:

> ''حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا ہی تقاضا نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔۔۔۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اِسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔'' (۱۰)

لینن انعام کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فیض نے کہا تھا

> ''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کے رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کی بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین برسوں پہلے فارسی شاعر حافظؔ نے کی تھی
>
> خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
> مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است ....(۱۱)

فیض کے یہاں انقلاب کا ایک واضح شعور اور اس کی شدید تڑپ تو موجود ہے لیکن انقلابی شاعری کے نام سے ہی ہمارے ذہن میں بالعموم چند بلند بانگ نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے جیسے سرخ سویرا طلوع ہونے کی نوید، خون کی ندیاں بہا دینے کا عزم، مزدور انقلاب زندہ باد، ترقی پسند شعرا میں سے بعض کی شاعری اسی سطح پر دکھائی دیتی ہے لیکن فیض کے یہاں کبھی بھی کوئی بات شعر کے درجے سے نہیں گرتی اُن کی کلیات میں ایک دو سے زیادہ ایسی نظمیں نہیں ملیں گی اور ان کی نوعیت بھی کچھ اس طرح کی ہے

کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت

چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے ....(۱۲)

جس طرح فیض محض رومانوی یا محض انقلابی شاعر نہیں ہیں اسی طرح فیض کو شاعرِ سوشلزم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر چہ فیض کی فکری تربیت میں مارکسی تصورات اور ادب کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس بات سے انکار ہو سکتا ہے کہ فیض کے نظریۂ حیات میں سوشلزم کو بنیادی دخل حاصل ہے لیکن شاعر کسی جماعت کے مینی فسٹو کا ترجمان نہیں ہوا کرتا، پارٹی لائن اُس کی شاعری کے خدوخال کا تعین نہیں کرتی لہٰذا فیض کی شاعری تقسیم دولت اور پیداوار کے ایک مخصوص نظام پر مبنی سماج کے قیام تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ اُن انسانی اقدار، جذبوں اور صداقتوں کی شاعری ہے جو دائمی ہیں، فیض امن و آزادی اور محبت و حسن کے شاعر ہیں یوں فیض زندگی کی Entransic Values کے شاعر ہیں اور یہ اقدار کسی ایک یا دوسرے دَور تک محدود ہوتی ہیں نہ ایک خطے اور ملک تک اور یہی چیز ہے جو فیض کو عالمی شاعر کا درجہ دیتی ہے، انہوں نے اپنی زندگی اور شاعری کا آغاز برصغیر میں عہد غلامی کے خلاف جدوجہد سے کیا اور اختتامِ تحریکِ جہادِ فلسطین کی قلمی معاونت پر، دنیا کے جس خطے میں بھی ظلم ہوا فیض نے اُس پر صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ ایرانی طلبہ ہوں، روزنبرگ جوڑا ہو یا کوئی اور حریت پسند، اسی طرح فیض دنیا کے ہر خطے میں ظلم کے خلاف ہونے والی جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھتے تھے۔ وہ افریقہ کے سیاہ فاموں کی بقائے حیات کی جنگ ہو، کربلائے بیروت کا احوال ہو یا ارضِ فلسطین کے جیالوں کا مقدس جہاد ہو یا اس خطۂ پاک کے دفاع میں شہید ہونے والا سپاہی، فیض نے ظالم کے ہر وار کو اپنی جان پر محسوس کیا ہے اور ہر مظلوم کے لہو کا خون بہا طلب کیا، یہ نظر اُس فن کار کے یہاں ہی پیدا ہو سکتی ہے جو زندگی کو اُس کی کلیت میں دیکھنے والے فلسفے پر یقین رکھتا ہو اِس نظر کی گواہی ''نسخہ ہائے وفا'' میں جا بجا بکھری ملے گی۔

فیض کی شاعری پر اُن کے چند ترقی پسند احباب کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا ہے کہ اس میں جمالِ لب و رخسار کا تذکرہ

تو بہت ہے لیکن مزدور کے مقدس پسینے کی خوشبو نہیں ملتی یا یہ کہ فیض ڈرائنگ روموں اور یونیورسٹیوں اور پروفیسروں کا شاعر تو ہے لیکن اُس کی شاعری اپنے ہی موضوع، کسان مزدور تک نہیں پہنچتی۔ فیض کی شاعری پر یہ اعتراض دراصل فنِ شعر سے ناواقفیت کی بنا پر ہے شاعری کا منصب سڑکوں پر مجمع لگانے میں مدد کرنا نہیں ہے۔ شاعری کو منصبِ شعر سے گرانا ترقی پسندی نہیں بلکہ کسان اور مزدور کے جمالیاتی علم و شعور کو شعر کی سطح تک بلند کرنا اصل کام ہے۔

فیض وعدے اور یقین کا شاعر ہے، وعدہ یعنی Commitment اپنے آدرش ــــ امن، آزادی، انصاف اور فروغِ حسن کے ساتھ اور یقین ــــ اس آدرش کی صبحِ روشن کے طلوع ہونے پر، فیض کو اُس دن کے وعدے کا یقینِ محکم ہے جو لوحِ ازل میں لکھا ہے وہ دن جب خلقِ خدا پر سے ظلم و جبر کی حاکمیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ابتدائی دَور میں فیض کے یہاں ظالم کے خلاف مارنے مرنے کا سارو یہ ہے جیسے

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے ــــ سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے ــــ ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا ...(۱۳)

لیکن جب فیض نے عمل کے راستے کو اپنایا اور شہرِ ظلم کی دیرینہ روایت کے مطابق انہیں پسِ زنداں جانا پڑا تو اُن کی شاعری نے وعدے اور یقین کی وہ غیر متزلزل قوت، سرشاری اور والہانہ پن حاصل کر لیں کہ وہ تخلیقِ فن کے آخری لمحوں تک آرزوؤں اور مقاصد کی کامرانی کے چراغ کی لَو کو بلند کیے رہے۔ زنداں کی شاعری بالعموم حزن وملال کا، افسردگی اور بےزاریت کا رنگ لیے ہوتی ہے لیکن فیض کے چار سالہ دورِ اسیری کی یادگار دستِ صبا اور زنداں نامہ کی تخلیقات میں امید، یقین اور نصب العین کی عاشقانہ سرمستی و سرخوشی کی ایسی دل آویز مثالیں ہیں کہ فیض کو پابندِ سلاسل کرنے والوں کے لیے بھی ان کے قاری کے دل سے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے ــــ اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے ــــ کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں ــــ وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں ....(۱۴)

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم .....(۱۵)

فیض نے ترقی پسندی کو محض نظریاتی اور ذہنی سطح پر قبول نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اُن کی شاعری بھی مجاز، مخدوم، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، جذبی، مجروح یا ہمارے عہد کے حبیب جالب کی سطح کی شاعری ہوتی۔ فیض کی بطور فن کار کامیابی کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے جدلیاتی آ گہی اور طبقاتی شعور کو عاشقی بنا دیا ہے۔

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے   ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے ...(۱۶)

ناظم حکمت کی ایک ترجمہ شدہ نظم میں کہتے ہیں:

ہم نے اُمید کے سہارے پر
ٹوٹ کر یوں ہی زندگی کی ہے
جس طرح تم سے عاشقی کی ہے .....(۱۷)

ناقدین بالعموم یہ کہتے ہیں کہ فیض نے اپنی لفظیات (ڈکشن) اور استعاروں کا نظام کلاسیکی شاعری سے مستعار لیا ہے، ہمارے خیال میں فیض نے اُردو اور فارسی کی شعری روایت سے محض اُسلوب کا حسن ہی نہیں اپنایا بلکہ انہوں نے غزل کے کردار--- عاشق کی تمام فعال خصوصیات اور عشق کے نظامِ اقدار کو اپنایا ہے اور اس طرز فکر و احساس کی روشنی میں اپنے عہد کی جدلیات کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔ فیض کی پوری شاعری ان کے اس رویے کے ذیل میں آتی ہے مثال کے طور پر اُن کی نظم ''دو عشق'' کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے، ایک عشق کا حال یوں ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے   کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو   ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں بانہیں ....(۱۸)

دوسرے عشق کا رنگ ملاحظہ ہو

چاہا ہے اِسی رنگ میں لیلائے وطن کو   تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
اُس جان جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے   ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرفِ تمنا کے تقاضے   ہر درد کو اجیارا ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا   تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں راحتِ تنِ صحتِ داماں   سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی ....(۱۹)

اِس روش کا انجام وہی ہوا جو ہوتا ہے لیکن فیض نے صرف دو مصرعوں میں کس انکساری سے اس کا بیان کیا ہے۔

اِس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ باز ....(۲۰)

نتیجہ یہ کہ

اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت ....(۲۱)

فیض نے غیروں کے ناوک دشنام بھی سہے اور اپنوں کی ملامتیں بھی لیکن اپنے آدرش پر اُن کا یقین کبھی غیر مستحکم نہیں ہوا بلکہ قید و بند کے ایام میں تو یہ استقامت فخر و غرور میں بدل جاتی ہے۔

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے شرمسار نہ تھے   ہر ایک سے سخنِ رازدار کرتے رہے ....(۲۲)

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے   دشنام تو نہیں ہے یہ اکرام ہی تو ہے
دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے   اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے ....(۲۳)

کوئے جاناں ہو یا کوچۂ قاتل دونوں میں فیض کی رفتار مستانہ و جانانہ ہی رہی، انہیں اپنے آدرش جسے وہ عشق کہتے ہیں، کا پاس ہمیشہ رہا۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا ....(۲۴)

یہ غرورِ عشق جس آگہی کا عطا کردہ ہے اُسی آگہی کے حوالے سے فیض اس بصیرت افروز حقیقت سے آشنا ہوئے ہیں کہ

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

جان بچانے کو فرض جاننے والے مصلحت اندیشوں پر دیکھیے کیسا لطیف طنز ہے

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجیے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے ....(۲۵)

اور اُدھر جانے کے سوا فیض کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ عاشق کے پاس زیست کرنے کا حوالہ صرف عشق ہوتا ہے اور اگر عشق کی زندگی کا ہر راستہ بند ہو جائے تو پھر عشق کی موت کا راستہ تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں   جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے ...(۲۶)

فیض نے ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے قتل پر جو خوب صورت نظم 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' تخلیق کی وہ اُن کے اسی عشق پر ایمانِ محکم کی بڑی نمایاں مثال ہے، چند مصرعے مذکورہ عنوان کے حوالے سے درج ہیں۔

جب گُھلی تیری راہوں میں شام ستم   ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم   اپنا غم تھا گواہی ترے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم   ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے ...(۲۷)

اگر منزل کے حصول میں عارضی ناکامی ہوئی تو بھی اطمینان قلب کی صورت دیکھئے

کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے   ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے ....(۲۸)

شکوہ کیوں ہو! جدو جہد کے سلسلے کا کوئی قدم کبھی رائیگاں گیا ہے کیا؟

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم   اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم   مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم   جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم ....(۲۹)
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض اپنے شعور کے زیرِ اثر تاریخِ انسانی کے مظالم کو ایک وسیع تر جدلیاتی تناظر میں دیکھتے ہیں اس اندازِ نظر کے تحت ان کے یہاں ظلم و ستم محض کو سنے اور مذمت کرنے کی حد تک بیان نہیں ہوئے بلکہ ان کا جو تاریخی کردار بنتا ہے، اس کا احساس بھی فیض کے یہاں بہت عام ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''ملاقات'' میں بنیادی طور پر یہی خیال نظم ہوا ہے کہ ظلم اور ستم ہی کے سبب مقاومت اور جہد و عمل کی قوت بیدار اور توانا ہوتی ہے۔ چند مصرع ملاحظہ ہوں:

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں
لاکھ مشعل بکف ستاروں کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اس سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اِسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے ....(۳۰)

ظلم کی اندھی قوت ہی ظلم کے خلاف مظلوم کا ہتھیار بن جاتی ہے

ہر ایک سیاہ شاخ کی کمان سے جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے ....(۳۱)

تاہم ظلم کی رات کوئی منزل نہیں ہے بلکہ اس رات کے ردِ عمل میں ابھرنے والا یقین اور صبحِ یقین بلند تر اقدار قرار پاتی ہیں

یہ غم جو اِس رات نے دیا ہے یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے سحر جو شب سے عظیم تر ہے ....(۳۲)

اہلِ ستم عشق کی استقامت کے روبرو بے چارگی کا شکار ہیں

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے ....(۳۳)

متاعِ حیات پر چھین جھپٹ کرنے والوں کی طرف سے جب بھی یہ احساس ہوا

ہاں تلخیِ ایام ابھی اور بڑھے گی ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے ....(۳۴)

تو فیض نے صفِ دوستاں کو یہی پیغام بھجوایا

رقصِ مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو سوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں ....(۳۵)

آمروں اور ڈکٹیٹروں کی رسمِ زباں بندی کوئی نئی بات نہیں اور نہ ہی عاشقانِ باصفا کی یہ ریت نئی ہے کہ

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری — فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں ۔(۳۶)

فیض کی کمٹ منٹ (Commitment) کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے — ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے ...(۳۷)

امن اور آزادی کی جدوجہد کا راستہ قلزمِ خوں کی شناوری ہے اس لیے فیض امید ویقین بھی دلاتے ہیں لیکن راہ کے کٹھن ہونے کی پیش بینی بھی کرتے ہیں

یہ راہیں جب اٹ جائیں گی — سو رستے ان سے پھوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی — سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے ...(۳۸)

انسانی تاریخ میں حق وباطل کی رزم آرائی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب حق پرستوں کو اپنی جان کا نذرانہ دے کر ہی ارتقائے مسلسل کے اس سفر کو جو بہر حال منزل کی جانب سفر ہے، جاری رکھنا پڑتا ہے، لیکن شہادت کے آخری لمحے تک جدوجہد لکیر فیض کی تلقین ہے

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو — کچھ تو کہو ستم کشو! فریاد کچھ تو ہو
مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا — اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا — رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو — جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو ...(۳۹)

فیض جانتے ہیں کہ جس عہد اور جس سماج میں وہ زیست کی رانی کے ماتھے پر جھومر اور امن کی دیوی کے ہاتھوں میں کنگن پہنا رہے ہیں وہ ظلم اور استحصال کے کس قدر بہیمانہ شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے لیکن اُن کا دل جس مسلک میں بیعت کر چکا تھا وہاں حقیر ترین عمل بھی زندگی سے فرار پر فائق ومحترم قرار پاتا ہے۔ اُن کا مسلک انہی کی زبانی سنیے

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس کی ضد پر
ہم نے اُس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر
جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا

دل کو تعبیر کوئی اور گوارا ہی نہ تھی
کلفتِ زیست تو منظور تھی ہر طور مگر
راحتِ مرگ کسی طور گوارا ہی نہ تھی ...(۴۰)

لہٰذا حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، مارشل لاء کے تاریک ادوار رخِ صبح کو کتنا ہی گہنا دیں، کوڑوں کی سڑاک سڑاک سماعت کے اعتبار کو ختم ہی کیوں نہ کر دے فیضؔ کا ایقان درد کی ہر گھڑی میں جواں رہتا ہے

ہم کہ ہیں کب سے درِ امید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چُن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے ....(۴۱)

فیضؔ کے یہاں حوصلہ مندی کی مثالیں ہر ہر صفحے پر ملیں گی

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو تو اک عمر پڑی ہے ...(۴۲)

فیضؔ کبھی کبھی لہجے کی بلند آہنگی کے ذریعے بھی اپنے قاری میں گرمی، حرارت اور توانائی پیدا کرتے ہیں

ہر اک اولی الامر کو صدا دو کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا ...(۴۳)

اِس ضمن میں آخری بات جس کا تذکرہ بے حد ضروری ہے وہ یہ کہ فیضؔ کی نظریاتی پختگی اپنے آدرش کی سچائی پر ایمان اور جہد و عمل کی قوتوں کی آخری فتح پر یقین نے اُن کی شخصیت اور شاعری میں ایک ایسی خصوصیت پیدا کی ہے جس کا سلسلہ ایک طرف تو عاشقانہ اُسلوب حیات سے قائم ہوا ہے اور دوسری طرف اُن کی شخصیت کا یہ دھیما پن، تحمل، برداشت اور پُر امن بقائے باہم ایسی جمہوری اقدار کی ترویج کرتا ہے جن کی قومی سطح پر آج ہمیں بے حد

ضرورت ہے،فیض کا اپنے نصب العین کے دشمنوں کے ساتھ رواداری کا رویہ اُن کی شاعری کی ایک بے حد توجہ طلب خصوصیت ہے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو گو بہ گو دلبر انہیں پسند اُنہیں ناپسند کیا کرتے ....(۴۴)

جو تمہاری مان لیں ناصحا! تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں نہ کسی صنم کی مروتیں ....(۴۵)

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غمگسار کوئی تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا ...(۴۶)

غمِ جہاں ہو ، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں ...(۴۷)

غمِ جہاں ہو رخِ یار ہو کہ دستِ عدو سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا ...(۴۸)

محتسب کی خیر، اونچا ہے اُسی کے فیض سے
رند کا ، ساقی کا ، مے کا ، خُم کا ، پیمانے کا نام ....(۴۹)

اس عاشقانہ کشادہ دلی کا ہی فیض ہے کہ اُن کے کلام میں نہ کوئی جھلاہٹ ہے نہ غراہٹ، نہ نعرہ بازی نہ بے عملی پیدا کر دینے والی قنوطیت اور نہ ہی شورِ ماومن یا نرگسیت یہی فیض کی شخصیت کا کمال تھا کہ ترقی پسندوں کے بدترین مخالف بھی فیض کے لیے سراپا سپاس دکھائی دیتے ہیں اور یہی ان کی شاعری کا اعجاز ہے کہ نکتہ چینوں کی ہر حرف گیری اور ہر قسم کی ناقدانہ بددیانتی کے باوجود اُن کے کلام کا حلقۂ مقبولیت وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے۔نسخہ ہائے وفا میں فیض کی باشعور اور حقیقت پسندانہ وطن دوستی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں باشعور اور حقیقت پسندانہ اس لیے کہ یہ وطن دوستی کہیں بھی دھرتی پوجا کی صورت اختیار نہیں کرتی لہٰذا فیض کی تخلیقات ''چاند میری زمیں، پھول میرا وطن''، قسم کی حب الوطنی بیان نہیں کرتیں،فیض نے اپنے وطن کو بہت سے رنگوں میں چاہا ہے لیکن اپنی چاہت کے ہر رنگ میں کہیں بھی جذباتیت کا شکار ہو کر، ارضِ وطن میں آغاز سے اب تک جاری ظلم وستم کی لاشعوری حمایت کرنے کے مرتکب نہیں ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد مملکتِ خداداد میں اس کے قیام کے مقاصد سے ہر موقع پر انحراف ہوا تو فیض نے ''صبح آزادی'' میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ آزادی سے انکار نہیں تھا، بلکہ اس سچائی کا اعتراف تھا کہ آزادی کے مقاصد سے صرفِ نظر کیا جا رہا ہے، یہ حقیقت کس قدر شرم ناک ہے کہ اس نظم کا خیال آج بھی اُس طرح سچ ہے جیسے اس کی تخلیق کے وقت تھا

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر — چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل — کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

لیکن جب ایسا نہ ہوا تو انہوں نے واشگاف انداز میں یوں اظہار کیا

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی — نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی ...(۵۰)

پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات کے سبب یہاں سچ بولنے اور سچ سننے کی روایت کبھی رائج نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس شرفِ آدمیت کی پامالی آئے دن کے مارشل لاؤں، قید و بند کی سزاؤں، ضمیر کے قیدیوں پر کوڑوں کی بارش کی صورت میں ہوتی رہی۔ تذلیلِ آدمیت کے یہ مناظر ہماری تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہیں۔ فیض نگارِ وطن کے عاشق تو ہیں لیکن وہ ایسے عاشق ہیں جس میں اِس لیلیٰ کے خیمۂ سیاہ کی ظلمت کو دیکھنے کا حوصلہ اور اظہار کی جرأت ہے۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں — چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے — نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد — کہ سنگ و خشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد ...(۵۱)

آئے دن حکومتیں بدلتی رہیں لیکن ہر حکومت کا مسلک ایک ہی تھا اور اس مسلک کی کوئی شق عوام دوستی کی شق نہیں تھی

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا — ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

فیض کی حب الوطنی پر مبنی شاعری کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ فیض نے کبھی وطن کو ماں سے تشبیہ نہیں دی۔ وہ اپنی محبت کے اظہار کے لیے ہمیشہ نگار، لیلیٰ اور محبوب کے الفاظ سے ہی وطن کو مخاطب کرتے ہیں شاید اس لیے کہ وطنِ عزیز کو ابھی ماں بننا ہے۔ ماں اتنی ناانصاف نہیں ہوتی اور نہ ہی ماں کی گود میں بچہ اتنا غیر محفوظ بلکہ خون میں نہلایا ہوا ہوتا ہے جیسا ہمارے شہروں کی سڑکوں، گلیوں اور عبادت گاہوں میں، لہٰذا فیض نے اس جانِ جاں کو اُنہی خصوصیات سے منسوب کیا جو خصوصیات کلاسیکی غزل کے محبوب کی ہیں۔ اسیری کے دور میں جب اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، فیض وطن کے بارے میں ہی سوچتے ہیں اور کس طرح سوچتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے　　کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے　　کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی ....(۵۲)

زنداں میں فیض وطن کا ذکر جلاوطن کی طرح کرتے ہیں

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے　　یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج یہ ہے طالعِ رقیب تو کیا　　یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

مارشل لاء کا موسم حساس بدن پر آبلے نکلنے کا موسم ہوتا ہے۔ پاکستان کے باشندگان اس موسم سے خوب واقف ہیں، انسانیت کی توہین کی اِس رُت میں فیض کو جلا وطن ہونا پڑا، اسیری اور جلاوطنی دونوں فیض کے تجربے میں اور یہ دونوں تجربے اُن کے یہاں تخلیق شعر کا موثر محرک بنے ہیں وطن کے بارے میں اُن کے احساسات میں ان دونوں تجربوں کے حوالے سے حیرت انگیز مماثلت دیکھی جاسکتی ہے۔ وطن زمین اور زمانے کا نام ہے جلاوطن کی طرح قیدی بھی اپنی زمین اور اپنے عہد کے لوگوں سے بچھڑا ہوا آدمی ہوتا ہے لہٰذا فیض زنداں میں جلاوطن کی حیثیت سے اور جلاوطنی میں اسیر کی طرح ذکرِ وطن کرتے ہیں، اُن کی زنداں کی شاعری کے حوالے سے تو چند مثالیں دی گئی ہیں۔اب جلاوطنی کے حوالے سے یادِ وطن کا رنگ فیض کے یہاں ملاحظہ کریں

ہر منزل غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا　　بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے
فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے
دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی　　تو فیض ذکر وطن اپنے روبرو ہی سہی
دل شکنی بھی دلداری بھی　　یادِ وطن کچھ اس سے زیادہ!

فیض ۷۸ء سے ۸۲ء تک بیروت کے درزخ میں مقیم تھے اس زمانے میں اُن کے خطوط وطن کی محبت اور وطن کے باسیوں کے بارے میں فکر وتردد سے بھرے پڑے ہیں۔اپنے سارے دکھوں پر فکرِ وطن غالب ہے

نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے　　خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے　　ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

اور اس دور کی معروف ترین نظم مرے دل مرے مسافر ہے

مرے دل مرے مسافر ہوا پھر سے حکم صادر کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں کریں رخ نگر نگر کا کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا ہر اک اجنبی سے پوچھیں جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں ہمیں دن سے رات کرنا کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا ہمیں یہ بھی تھا غنیمت جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

پاکستان کی تاریخ عہد شکنیوں اور وعدہ خلافیوں کی تاریخ ہے، یوں گماں ہوتا ہے کہ سرزمینِ وطن وعدوں کی شکست کی سرزمین ہے نسخہ ہائے وفا میں ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کے حوالے سے بہت سی نظمیں اور غزلیں ہیں، قومی دنوں کے موقع پر فیض بھی شاید کھیتوں کے سونے اور فصلوں کی چاندی کا ذکر کرتے لیکن ان دنوں کے حوالے سے اُن کی نظر اُن وعدوں اور پیمانوں پر جاتی ہے جو بانیانِ پاکستان سے لے کر آج تک کیے جاتے رہے، فیض کی محبت پر اُن کا حساس شعور غالب رہتا ہے، لہٰذا پوچھتے ہیں

تیرے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے کتنے وعدے جو نہ آسودہ اقرار ہوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی خواب کتنے تیری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے

محبوب سے گفتگو کرتے وقت لہجے کی ملائمت کو ہاتھ سے جانے دینا عاشق کو زیب نہیں دیتا، لیکن فیض وطن دوست بھی ہیں لیکن اس سے بڑھ کر وہ عوام دوست ہیں اس لیے آئے دن کی خوں ریزی کے حوالے سے لیلائے وطن سے قدرے نا ملائم لہجے میں سوال کرتے ہیں

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کرے
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا کتنے آنسو تیرے صحراؤں کو گلزار کریں ...(۵۴)

فیض فرد پر ہونے والے ظلم کو تو فراموش کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن اُسی وقت جب خون کا یہ موجزن سمندر محض ماضی کا حوالہ بن جائے تب!

بلا کشانِ محبت یہ جو ہوا سو ہوا جو مجھ پہ گزری مت اُس سے کہو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر لہو کے داغ تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

اسی نظم کے آخری بند کی عاشقانہ وارفتگی اور خلوصِ دعا فیض کی وطن سے شدید محبت کا مظہر ہیں

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں   اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم   ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

وطنِ عزیز کی تاریخ کے ہر موڑ پر فیض نے اپنے فکروفن کی روشنی میں تخلیقِ شعر کا فریضہ ادا کیا۔ قیامِ پاکستان ہو یا مسلم لیگ کے دورِ حکومت کی عوام دشمنیاں، جاگیرداری کو شریعت کا تحفظ فراہم کرنا ہو یا فردِ واحد کے مفادات کو آئین قرار دینا، پاک بھارت جنگ ہو یا خودساختہ امیر المسلمین کا اصول و آئین کی دھجیاں بکھیرنا ہو یا مارشل لاء کے اصنام کا دعویٰ خدائی، نسخہ ہائے وفا پاکستان کی تاریخ کے تمام حساس لمحوں کا نہایت باشعور ریکارڈ بھی ہے۔ ہم یہاں صرف سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے چند تخلیقات کا ذکر کریں گے اس سلسلے میں کتاب میں دو نظمیں اور ایک غزل ہے۔ جس زمانے میں افواجِ پاکستان مشرقی پاکستان میں خون کی ہولی کھیل رہی تھیں تو فیض نے خبردار کیا تھا

مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے   چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
مگر وہ زہرِ ہلاہل بھرا ہے نس نس میں   جسے بھی چھیدو ہر اک بوند قہرِ افعی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ سَم کا دریا ہے   اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشک صبا میری جانِ زار کی دھول ...(۵۵)

دوسری نظم بلاعنوان میں فیض نے التجا کی تھی

چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا، کوئی سیلابِ اشک، آبِ وضو
جس میں دھل جائیں تو شاید دھل سکیں
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو ....(۵۶)

برسوں بعد بھی اس المیے کی بازگشت فیض کے یہاں سنی جا سکتی ہے ''ڈھاکہ سے واپسی پر'' ۱۹۷۴ء کی تخلیق ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد   پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

فیض کی پوری زندگی وطن دوستی سے عبارت ہے، انہوں نے اس سلسلے میں کبھی مجہول قسم کی مثالیت پسندی کا ثبوت نہیں دیا وہ اس طرح کہ ان پر ذاتی حیثیت میں ظلم کرنے والوں نے بھی اگر انہیں پاکستان کے حوالے سے کوئی خدمت سپرد کی تو انہوں نے اسے قبول کیا۔ اس طرح جب کبھی ان کے دوستوں اور اہلِ خانہ نے ملک سے باہر سکونت اختیار کرنے پر اصرار کیا تو فیض نے اسے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اپنی نظم ''فرشِ نومیدی دیدار'' میں فیض وطن واپسی

کے لیے بے تاب ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وطن میں کون کون سے دکھ، درد اور حادثے ان کے منتظر ہیں لیکن وطن کے دکھ درد بھی باہر کے عیش و آرام سے زیادہ پسندیدہ ہیں شاید!

اور دل کہتا ہے ہر بار چلو لوٹ چلو
اس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دکھ بھی نہ ہو
یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اُس صحن میں ہر سو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدیٔ دیدار بچھا ہے اب بھی ...(۵۷)

عشق کی واردات اور حسنِ رخِ یار کی یاد فیض کے یہاں بنیادی تخلیقی محرک ہیں، اُن کے یہاں حسن کی طلب اور بیان جس قدر زیادہ ہے اتنا ہی اُن کا تصور جمال تہذیب یافتہ ہے۔ فیض کے یہاں عشق ہی وہ جذبہ ہے جو راہِ حیات میں عمل اور جدوجہد کی امنگ پیدا کرتا ہے اور ہر سسّی کو تھل کی تپتی ریت پر سفر کرنے کے لیے کیچ کا سائبان چاہیے ہوتا ہے۔ جمال لب و رخسار اور یادِ حسنِ یار، فیض کے لیے ایسا ہی سائبان ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

تخلیق شعر ہو یا مشقتِ زیست دونوں کا حوالہ حسن یار قرار پاتا ہے

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک جہاں میں باقی ہے دلداریِ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک تمہارا دم ہے تو دم ساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ میں اوقات سخت ہیں ایام تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

کبھی صبح انقلاب اور رخِ یار کی لہر ایک دوسرے کا اس طرح متبادل ہو جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے ممیّز کرنا ممکن نہیں رہتا

ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں جو تیرے لب، ترے بازو ترا کنار نہیں
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف بکھرانے کا نام موسمِ گل ہے تمہارے بام پہ آنے کا نام

جس طرح میرؔ نے کہا تھا

دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے

یہی نشہ فیض نے جمال یار سے لیا اور یوں عمر بھر اپنی ہر صبح ہر شام کو مہکائے رکھا

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں نکھر گئی ہے فضا تیرے پیراہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے میری سَحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

یا یہ کہ

تری صورت جو دلنشیں کی ہے آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

اس حوالے سے یاد کے استعارے کو فیض کے یہاں بنیادی اہمیت حاصل ہے ان کے حافظے میں حسن کا ہر انداز ہر زاویہ، سارے رنگ اور تمام خوشبوئیں ہمہ وقت تازہ رہتی ہیں، یہی یاد تلخی ایام کو سازگار بنانے کا موثر حربہ بھی ہے

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

جب تجھے یاد کرلیا صبح مہک مہک اُٹھی جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی
تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام وہ عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام
یادِ غزال چشماں ، ذکرِ سمن عذاراں جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

اس سلسلے کا بہترین حوالہ اُن کی نظم ''یاد'' ہے

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب

آخری بند ملاحظہ ہو

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات ....(۵۸)

حد یہ ہے کہ فیض جب اپنی موت کا تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آخری لمحوں میں اُن کی زبان پر جو کلمہ ہوگا اُس میں بھی ذکر مہ وشان ہی ہوگا!

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرفِ وداع کی صورت
للہ الحمد با انجام دلِ دل زدگاں
کلمہ شکر بنامِ لب شیریں دہناں ...(۵۹)

یاد کے علاوہ فیض کے یہاں ''ہاتھ'' اور ''صبا'' کے استعارے بھی بکثرت استعمال ہوئے ہیں یہاں صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کی جاتی ہے

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
چمن میں غارتِ گل چیں سے جانے کیا گزری قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

ہاتھ فیض کے یہاں کبھی دستِ صیاد ہے، کبھی کفِ گل چیں، یہ ہاتھ قاتل کا بھی ہے اور دستِ بہانہ جو بھی، محنت کشوں کے یہاں یہی ہاتھ عمل و حرکت کا استعارہ ہے، محبوب کے حوالے سے یہ دستِ صبا بھی ہے۔

نقش فریادی کے ابتدائی دور کے بعد فیض کا تصورِ محبت مسلسل ارتقا پذیر رہا ہے بعد کی شاعری میں ہمیں اُن کے یہاں جس قسم کی محبت کے خدوخال ملتے ہیں وہ فارسی اور اُردو شعر کی روایت میں حد درجہ منفرد اور یکتا قسم کی محبت ہے، شعور کی پختگی کا عشق جو فیض کا عشق ہے، ہجر و وصال کی معین اذیت اور مقررہ لذت سے جداگانہ شے ہے، اسی لیے فیض کے یہاں ہجر کی شکایت میں کوئی مبالغہ ہے، نہ وصال پر ندیدے پن سے اصرار، یہ محبت ہجر و وصال سے ماورا ہو چکی ہے جیسے غم و مسرت باہم دگر مل کر ایک نا قابل بیان قسم کی کیفیت کو جنم دیں۔ وصل کی راحتیں ماضی کی یاد ہیں لیکن ہجر اذیت ناک اس لیے نہیں رہا کہ اب عشق بدن کی طلب سے آگے کی منزل تک جا چکا ہے لیکن محبتوں کے اعتبار نے سرشاری کی کیفیت کو ختم نہیں ہونے دیا۔

آخری عمر کی ایک نظم ''غبارِ ایام'' والے حصے میں ہے ''جو میرا تمہارا رشتہ ہے'' فرماتے ہیں

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں ہے

لکھا گیا ہے، بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں

''نسخہ ہائے وفا'' میں دو نظمیں ایک ہی عنوان سے ہیں ''کوئی عاشق کسی محبوبہ سے'' ایک نظم زنداں نامہ میں ہے اور دوسری مرے دل مرے مسافر میں، یہ دونوں اور مذکورہ بالا نظم، فیض کی محبت کے منفرد ترین تجربے کو سمجھنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ پہلی نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

یاد کی راہ گزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
سانس تھامے میں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ گزر جاؤ یا مڑ کر دیکھو
تم سے چلتی رہے یہ راہ یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

دوسری نظم جو فیض نے ۶۷ برس کی عمر میں نظم کی 'مرے دل مرے مسافر' میں شامل ہے، کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

جیسے بے گانہ سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا
گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو ...(۶۰)

محبت کا آغاز جس قدر آسان ہوتا ہے، ختمِ دردِ عشق کا مرحلہ اتنا ہی کٹھن ہوتا ہے، بلا شبہ خدا حافظ کہنے کا مرحلہ محبت کا مشکل ترین مرحلہ ہے، اس مرحلے سے کامیاب گزرنے کے لیے تو ایک عمر کی ریاضت اور سلیقہ چاہیے، فیض اس مرحلے سے بھی کامیاب گزرے ہیں اور نسخہ ہائے وفا میں اس کی مثالیں بہت عام ہیں۔

--☆--☆--

حوالہ جات

۱- صلاح الدین حیدر، ''فیض احمد فیض شخصیت اور فن''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ص ۳۸۵، نسخہ ہائے وفا سالِ اشاعت نہیں ہے۔

۲- فیض کے بارے میں یہ سوانحی معلومات نسخہ ہائے وفا کے فلیپ، متاعِ لوح و قلم، صلیبیں میرے دریچے میں، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، ''فیض احمد فیض شخصیت اور فن''، از صلاح الدین حیدر سے ماخوذ ہیں۔

۳- 'یاس'، مشمولہ نقشِ فریادی، ص ۳۹-۴۰

۴- ''نقشِ فریادی کی تخلیقی کے دو ادوار''، ۱۵/ اپریل ۱۹۷۲ء کو ادارہ یادگارِ غالب کی تقریب بسلسلہ نقشِ فریادی میں فیض کی گفتگو سے اقتباس مشمولہ متاعِ لوح و قلم، ص ۵۸، ناشر مکتبہ دانیال کراچی، دسمبر ۱۹۷۳ء

۵- نقشِ فریادی، ص ۵۴

۶- ''سوچ''، مشمولہ نقشِ فریادی، ص ۵۶

۷- 'چند روز اور میری جان'، مشمولہ 'نقش فریادی'، ص ۶۷، 'نسخہ ہائے وفا'، ص ۵۷

۸- 'تنہائی'، مشمولہ نقش فریادی ص ۶۳، نسخہ ہائے وفا، ص ۷۱

۹- دست صبا کا دیباچہ بعنوان ابتدائیہ، ص ۵۷

۱۰- ایضاً

۱۱- اقتباس از فیض صاحب کی لینن امن انعام کی تقریب سے خطاب بعنوان 'تقریر' مشمولہ 'دست تہہ سنگ'، ص ۹، نسخہ ہائے وفا ۳۰۳

۱۲- نظم 'ترانہ' مشمولہ 'دستِ صبا'، ص۴۲

۱۳- نظم 'سوچ' مشمولہ 'نقش فریادی ص ۵۸، نسخہ ہائے وفا، ص ٦٦

۱۴- نظم 'زنداں کی ایک شام' مشمولہ 'دست صبا'، ص۸۴، نسخہ ہائے وفا ۱۸۰

۱۵- 'طوق ودار کا موسم'، مشمولہ دست صبا، ص۳۱، نسخہ ہائے وفا ۱۲۷

۱٦- غزل، مشمولہ 'مرے دل مرے مسافر'، ص ۲٦، نسخہ ہائے وفا، ٦۱۴

۱۷- 'غبار ایام'، ص ۲٦، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ص ٦۹۴

۱۸-۲۱- 'دو عشق' از 'دستِ صبا' ص ۴۷ تا ۵۰، نسخہ ہائے وفا ۱۴۳ تا ۱۴٦

۲۲- غزل از 'زنداں نامہ'، ص۵۳، نسخہ ہائے وفا ، ص۲۴۳

۲۳- غزل از 'زنداں نامہ'، ص٦٦، // ، ص۲۵٦

۲۴- غزل از 'دست تہ سنگ'، ص٦۵، نسخہ ہائے وفا، ص ۳۵۵

۲۵- غزل از 'زنداں نامہ'، ص ۷۷، نسخہ ہائے وفا، ص ۲٦۷

۲٦- غزل مشمولہ زنداں نامہ، ص ۷۱، نسخہ ہائے وفا، ص ۲٦۱

۲۷-۲۹- 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، مشمولہ زنداں نامہ، ص۴۷-۲۷، نسخہ ہائے وفا، ص ۲٦۴-۲٦۲

۳۰-۳۲- نظم 'ملاقات' مشمولہ زنداں نامہ، ص ۵۴-۵۵، نسخہ ہائے وفا ۲۴۴-۲۴۵

۳۳- غزل از 'دستِ صبا' ص ٦۹، نسخہ ہائے وفا ۱٦۵

۳۴- 'لوح وقلم' از 'دستِ صبا'، ص ۲۳، نسخہ ہائے وفا، ص۱۱۹

۳۵- غزل از دستِ صبا، ص٦۲، ص ۱۵۸

۳٦- غزل از 'دست صبا' ص ۳٦، نسخہ ہائے وفا، ص۱۳۲

۳۷- قطعہ از 'دستِ صبا'، ص ۱۱، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۰۷

۳۸- 'پاؤں سے ہو کر دھوڑا کو'، مشمولہ 'شام شہر یاراں'، ص ۴۲، نسخہ ہائے وفا، ص ۵۱٦

۳۹- 'بنیاد کچھ تو ہو'، مشمولہ زنداں نامہ ۹۱-۹۰، نسخہ ہائے وفا'، ص ۸۱-۲۸۰

۴۰- 'ہم تو مجبور تھے اس دل سے' از 'شام شہر یاراں'، ص ۵۱-۵۰، نسخہ ہائے وفا، ص ۲۵-۵۲۴

۴۱- 'درِ اُمید کے در یوزہ گر' مشمولہ 'شامِ شہر یاراں' ص ۷۰، نسخہ ہائے وفا ۵۴۴

۴۲- 'اُس وقت تو یوں لگتا ہے' مشمولہ 'غبارِ ایام' ص ۱۶، نسخہ ہائے وفا ص ۶۳۴

۴۳- 'تین آوازیں' - ندائے غیب، مشمولہ مرے دل مرے مسافر ۳۳، نسخہ ہائے وفا ص ۶۳۹

۴۴- غزل از 'دستِ صبا' ص ۵۱، نسخہ ہائے وفا ص ۱۴۷

۴۵- غزل از 'مرے دل مرے مسافر' ص ۴۰

۴۶- غزل از شام شہر یاراں، ص ۵۹، نسخہ ہائے وفا ص ۱۷۶

۴۷- غزل از 'دستِ صبا' ص ۸۰، نسخہ ہائے وفا ۵۵۳

۴۹- غزل از 'دستِ صبا' ص ۵۶، نسخہ ہائے وفا ۱۵۲

۵۰- 'صبح آزادی اگست ۴۷ء' مشمولہ دستِ صبا، ص ۲۰

۵۱-۵۲- 'نثار میں تیری گلیوں کے....' مشمولہ دستِ صبا، ص ۶۵

۵۳- 'میرے ملنے والے' مشمولہ مرے دل میرے مسافر، ص ۵۷

۵۴- 'ہم تو مصبو ر وفا ہیں' مشمولہ مرے دل مرے مسافر، ص ۳۸

۵۵- 'مذر کرو مرے تن سے' مشمولہ سر وادی سینا، ص ۸۵

۵۶- نظم بلاعنوان از 'سر وادی سینا' ص ۸۸

۵۷- 'فرنو میری دیدار' مشمولہ سر وادی سینا، ص ۸۷

۵۸- یاد از وستِ صبا، ص ۸۸

۵۹- جس روز قضا آئے گی از شام شہر یاراں، ص ۳۸

۶۰- 'کوئی عاشق کسی محبوبہ سے' مشمولہ مرے دل مرے مسافر، ص ۱۲-۱۱، نسخہ ہائے وفا ص ۶۱۷